بشیر احمد ڈار

عقل و عرفان

"ثقافت" کے شمارۂ مارچ میں مولانا جلال الدین رومیؒ کے اس نظریہ کی وضاحت کی گئی تھی کہ انسان کے لئے اہم ترین علم اپنی حقیقت کا عرفان ہے لیکن معاصر محترم "طلوعِ اسلام" نے اس واضح نظریہ پر چند اعتراضات کئے جن کا جواب اپریل کے "ثقافت" میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کے بعد "عرفانِ الٰہی" کے عنوان سے "طلوعِ اسلام" میں اس نظریہ پر مزید تنقید کی گئی۔ چنانچہ پیشِ نظر مضمون میں اس موضوع سے متعلق قرآنی آیات نیز اقبالؒ و دیگر مفکرین کے خیالات کو بھی واضح کیا گیا ہے جن سے اس نظریہ اور مذکورہ بالا وضاحت کی تائید ہوتی ہے:

عقل و عرفان کی بحث ایک حیثیت سے بہت قدیم ہے، تمام قوموں کا صوفیانہ لٹریچر اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں کی بحث و تمحیص سے بھرا ہوا ہے لیکن دورِ جدید کے آغاز سے جب زمانۂ وسطیٰ کے فلسفہ اور تصوف کے خلاف ردِ عمل شروع ہوا تو اور بہت سے مسلمہ عقائد اور تصورات کے ساتھ ساتھ عرفان کے وجود اور اس کی افادیت سے بھی کلی انکار کیا گیا اور اس طرح حواس و عقل کی بنیاد پر حاصل کردہ علم کو ہی واحد ذریعہ تسلیم کیا گیا۔ انیسویں صدی عقلیت پرستی کا دور قرار پایا اور ہر وہ علم جو حواس اور استدلال کی بنیاد پر قائم نہ تھا یا جس کی تصدیق ان ذرائع سے نہ ہو سکتی تھی، ناقابلِ قبول اور مردود قرار پایا۔ چنانچہ مذہب اور اخلاق کے تمام بنیادی تصورات انسان کے عزائم اور خواہشات، خدا کا وجود اور انسانی اختیار و ارادہ سب توہمات بن گئے۔ یہ دورِ عقلی علوم کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا، اور اسی دور میں طبیعات نے تمام دیگر علوم پر فوقیت حاصل کر لی۔ اس کے زیرِ اثر علم النفس اور علم حیاتیات نے مادی میکانیت کو اپنایا اور حیات اور نفسِ انسانی کو مادہ کی طرح بے جان، بے ارادہ اور بے عمل حیثیت سے اپنا موضوع بنایا۔

لیکن جلد ہی اس عقلیت پرستی کے نتائج و عواقب ظاہر ہونے شروع ہوئے اور برطانوی فلسفی ہیوم کا فلسفۂ تشکیک اس دور کا منتہائے عروج تھا۔ حقیقت کی تلاش میں عرفان کا سہارا چھوڑ کر عقل محض پر بھروسہ کرنے سے ذہنی انارکی اور تشکیک کا پیدا ہونا ایک دائمی اور قدرتی عمل ہے جو انسانی تاریخ کے مختلف ادوار میں نمایاں ہوتا رہا ہے۔ جرمن فلسفی کانٹ نے اس عقلیت پرستی پر بڑی کاری ضرب لگائی۔ اس نے خالص عقلی طریقے سے عقلیتِ محض کا تار و پود بکھیرا کہ خود طبیعات جو انسانی حواس و عقل کے دائرہ سے باہر ایک قدم رکھنا بھی برداشت نہ کر سکتی تھی اب اعترافِ عجز اور اقرارِ حقیقت پر مجبور ہو گئی۔ فرانسیسی مفکر برگسان نے اس سلسلہ میں محض سلبی طور پر عقل کے حدود متعین کرنے پر اکتفا نہ کی بلکہ عرفان کی افادیت پر پورا زور دیا اور یہ مسلک پیش کیا کہ عقل استدلالی اور عرفان دونوں اپنی اپنی جگہ فائدہ مند اور ضروری ہیں۔ ہر ایک کا حلقۂ عمل جداگانہ ہے جس میں وہ رہنمائی کر سکتا ہے لیکن اس حلقہ کے باہر وہ نہ صرف بے کار بلکہ گمراہی کا

موجب ہوتا ہے۔ جہاں تک مادی دنیا کا تعلق ہے جو علم طبیعات کا موضوع ہے عقل استدلالی صحیح راہنما ہے لیکن علم طبیعات صرف حقیقت کے ایک پہلو کا مطالعہ کرتی ہے اس لئے اس کے قائم کردہ نتائج حقیقت کلی پر منطبق نہیں ہو سکتے اور نہ عقل سے حقیقت کلی کا احاطہ کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ برگسان نے حقیقت کلی کا علم حاصل کرنے کیلئے عرفان کا نظریہ پیش کیا۔

یہ عرفان کیا چیز ہے؟ برگسان کے خیال میں عرفان کسی شئے کا بلاواسطہ علم ہے جس میں ہمارے حواس اور عقل کا بظاہر کوئی دخل نہیں۔ اس سے ہم اشیاء کی صحیح اندرونی ماہیت سے براہ راست تعلق محسوس کرتے ہیں عقل استدلالی علم حاصل کرنے کیلئے آہستہ روی اور تدریج کا راستہ اختیار کرتی ہے اور عرفان تمام رکاوٹوں کو نظر انداز کر کے مقصد براری کر لیتا ہے عقل ایک چیز کے ارد گرد چکر کاٹتی ہے اور اسکے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ کرتی ہے تب جا کر اسے اس کا علم حاصل ہو سکتا ہے لیکن عرفان اس چیز پر بلاواسطہ حملہ کر کے اسکی ماہیت سے واقفیت تام بہم پہنچاتا ہے۔ عرفان کی یہ صفت برگسان کے خیال میں انسان کی حیوانی جبلتوں کے مماثل ہے جو بلاواسطہ اپنا مقصد حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں لیکن عمل ارتقاء میں عرفان بہ مقابلہ جبلت ایک پختہ تر، مکمل تر اور کامیاب تر لائحہ عمل ہے جسکی رو سے انسان حقیقت کلی کا مشاہدہ حاصل کرتا ہے۔ اگر انسان مقام عقل میں الجھا رہے تو اس کی زندگی بے جان مشین کے عمل سے مختلف نہ ہوگی اور وہ بقول اقبال مرد حر نہیں بلکہ غلامی اور عبدیت کی زنجیروں میں مقید ہوگا صحیح آزادی حاصل کرنے کیلئے عقل سے گزر کر عرفان سے لذت اندوز ہونا ناگزیر ہے۔

اقبال نے برگسان کی تتبع میں نفس انسانی کے دو مختلف مدارج کا ذکر کیا ہے۔ ایک سطح فاعلی (EFFICIENT) ہے جس کا تعلق روزمرہ کی زندگی سے ہے جس میں انسان عقل کی راہنمائی سے اپنے معمول کے کاموں کو سرانجام دیتا ہے۔ اس سطح پر اسکی زندگی میکانکی ہوتی ہے اور وہ انسانیت کے درجہ سے گر کر حیوانیت کے مقام پر آ جاتا ہے۔ عادات اور جبلتوں کے تقاضوں سے مجبور ہو کر اپنا اختیاری اور روحانی منصب فراموش کر ڈالتا ہے، امروز و فردا کی شکمی ضروریات اسے مستقبل کے عزائم سے بے پروا کر دیتی ہیں دوسری سطح ذوقی (APPRECIATIVE) ہے جس میں انسان اپنے قلب کی گہرائی سے بلاواسطہ رابطہ قائم کرتا ہے اور اس طرح سرچشمہ حیات سے نئی قوت حاصل کرتا ہے۔ اس سطح میں وہ انسانیت کا صحیح مقام حاصل کر لیتا ہے، غلامی کی زنجیریں توڑ کر مرد حر بن جاتا ہے۔ قلب کی گہرائیوں میں ڈوب کر ابھرنا ہی صحیح عرفان ہے اقبال نے گلشن راز جدید میں "چہ معنی دارد اندر خود سفر کن؟" کے جواب میں اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے اس کا خیال ہے کہ عرفان نفس ہی سے انسان میں روحانی انقلاب ظہور پذیر ہوتا ہے جس سے نہ صرف اس کی قلب ماہیت ہو جاتی ہے بلکہ معاشرہ بھی اس سے اثر پذیر ہوتا ہے۔

سفر در خویش؟ زادن بے اب و دام — ثریا را گرفتن از لب بام
ستردن نقش ہر امید و بیمے — زدن چاکے بہ دریاچوں کلیمے
چناں باز آمدن از لامکانش — دریدن سینہ او درکف جہانش

اسلام نے اسی لئے نفس کی ذوقی سطح کو بروئے کار لانے کیلئے عبادت تجویز کی۔ اگر نماز کو صحیح طور پر ادا کیا جائے تو اس سے نفس انسانی خدا سے بلاواسطہ رشتہ قائم کرتا ہے اور اس طرح نماز کے ذریعہ اسلام نے انسانوں کو مشینی زندگی کے خطرناک نتائج سے بچانے کی کوشش کی گویا دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ عبادت عرفان نفس اور عرفان خدا دونوں کا ذریعہ ہے۔ جب تک عرفان نفس نہیں ہوتا اور اسی نفسی واردات

پر عرفانِ خداوندی کا انحصار ہے، تب تک عبادت کا صحیح مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔

لیکچروں میں ایک جگہ علامہ اقبال لکھتے ہیں کہ "مذہب محض عقلی تصورات پر اکتفا نہیں کر سکتا، وہ خدا کے تعالیٰ کے ساتھ زیادہ قریبی تعلق اور رابطہ پیدا کرنا چاہتا ہے۔ یہ رابطہ عبادت سے حاصل ہو سکتا ہے اور اس سے انسانی قلب میں ایک قسم کا روحانی نور حاصل ہوتا ہے۔ ——— عبادت تفکرِ عقلی کی طرح ایک ذریعہ علم ہے لیکن اس سے کہیں بلند ——— فکری عمل میں انسانی ذہن حقیقت کا مطالعہ خارجی طور پر کرتا ہے لیکن عبادت میں وہ اس خارجی مطالعہ کو ترک کر کے حقیقت پر محیط ہونا چاہتا ہے تاکہ شعوری طور پر اسکی برتر اور اعلیٰ حیات میں شریک ہو سکے . . . . یہ عبادت جو روحانی نور کا موجب ہوتی ہے ایک غیر عقلی اور ارادی عمل ہے جس سے ہماری حقیر خودی حیات کے عظیم الشان سمندر میں ایک اعلیٰ مقام حاصل کر لیتی ہے . . . یہ حیات کے ان سوتوں کو بیدار کرتی ہے جو انسانی نفس کی گہرائیوں میں خوابیدہ ہوتے ہیں" (صفحات ۸۹، ۹۰) اسی لئے اقبال نے اپنے کلام میں عرفان نفس یا خودی پر زیادہ زور دیا اور اسی عرفان پر ذاتِ خداوندی کا عرفان منحصر لکھا۔

بخود رس از سرِ ہنگامہ برخیز   تو خود را در ضمیرِ خود فرو ریز

یعنی اس ہنگامۂ امروز و فردا کی گہما گہمی کو کچھ عرصے کیلئے نظر انداز کر دو کیونکہ صحیح زندگی اس گہما گہمی سے حاصل نہیں ہوتی اسکے لئے عارضی طور پر قطع علائق کی ضرورت ہے اور حیات کے سرچشموں سے فیضیاب ہونے کے لئے اپنے قلب کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہونا ناگزیر ہے۔

چراغے در میانِ سینۂ تست   چہ نور است این کہ در آئینۂ تست؟
مشو غافل کہ تو او را امینی!   چہ نادانی کہ سوئے خود نہ بینی!

جاوید نامہ میں جہاں دوست کی زبان سے چند سوالات کا جواب دیا گیا ہے۔ اس میں مذہب کی حقیقت 'عرفان' یا 'دید' قرار دی ہے۔

گفت دینِ عامیاں؟ گفتم شنید   گفت دینِ عارفاں؟ گفتم کہ دید

اور اس 'دید' کی تفصیل دوسری جگہ یوں بیان کی گئی ہے:

چشم بر حق باز کردن بندگی است   خویش را بے پردہ دیدن زندگی است

یعنی عرفان میں نہ صرف زندگی بلکہ مذہب بھی مضمر ہے اور اسی عرفان یا 'دید' کے حصول کے مدارج پر صحیح انسانیت کا مقام متعین ہوتا ہے۔ جس کا عرفان زیادہ ہو گا۔ اس کا رتبہ اسی نسبت سے بلند ہو گا۔

کسے کو دیدۂ عالم را امام است   من و تو ناتمام او تمام است

اسی عرفان یا دید کو صوفیاء نے اپنے مشہور مقولے من عرف نفسہٗ فقد عرف ربہٗ (جس نے نفس کا عرفان حاصل کیا تو گویا اس نے خدا کا عرفان کر لیا) میں ظاہر کیا ہے اور مندرجہ بالا بحث کو مدِّنظر رکھتے ہوئے اس میں کوئی غیر اسلامی بات نہیں۔ اگر آپ اسی مقولے کو اقبال کے الفاظ میں بیان کرنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ جس شخص نے نفس کی عمیق سطح کو اسکی فاعلی سطح پر غالب کر لیا جس نے روزمرہ کی زندگی میں اپنے قلب سے وابستگی حاصل کر لی اور ذکر اللہ سے اسے استوار کر لیا تو اس کو حقیقت ازلی کا صحیح عرفان ہو گیا۔

عطار ہو رومی ہو رازی ہو غزالی ہو   کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحر گاہی

یہ آہ سحرگاہی، یہ ذکرِ قلبی یا عرفانِ نفس علم استدلالی و معقول کی ضد نہیں بلکہ اسکی تکمیل ہے محض علم استدلالی بقول مصنف معارف القرآن ابلیس کی سنت ہے (جلد دوم صفحہ ۷۶، ۷۷) اس معاملہ میں مولانا روم کا مشہور شعر ہے:

زیرکی ز ابلیس و عشق از آدم است دانند آں کو نیکبخت و محرم است

اور اقبال نے بھی لیکچرز اور اشعار میں بار بار اس نکتہ کی وضاحت کی ہے جبتک عقل استدلالی کے ساتھ جسکا ماخذ سمع و ابصار ہیں، آہ سحرگاہی یا ذکر قلبی کو شامل نہ کیا جائے تو انسان آدمیت کے مقام سے گر کر ابلیسی خلافت کا جامہ پہن لیتا ہے۔ موجودہ دور کی مادہ پرستی اور عقلیت نوازی کے خطرات و عواقب کے پیشِ نظر اس "آہ سحرگاہی" پر اقبال نے پورا اور جائز زور دیا اور اس معاملہ میں وہ مولانا روم کا صحیح معنوں میں مرید نظر آتا ہے، اسی نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے "ثقافت" (مارچ ۱۹۵۵ء) کے ایک مضمون میں مندرجہ ذیل الفاظ درج تھے "انسان کیلئے اہم ترین علم اپنی حقیقت کا عرفان ہے اور دین کا مقصود آخری و غایت خدا کا عرفان ہے"۔ اس پر مجلّہ "طلوعِ اسلام" (۱۹ مارچ) میں جو صاحب معارف القرآن کے نظریات و افکار کا ترجمان ہے، مندرجہ ذیل الفاظ میں تنقید کی گئی تھی:

(۱) قرآن خدا کی ذات پر ایمان کا مطالبہ کرتا ہے، اس کے عرفان کا نہیں ...... دین کا مقصود خدا کا عرفان نہیں۔

(۲) قرآن نفسِ انسانی کے عرفان کا بھی مطالبہ نہیں کرتا، وہ نفس انسانی پر غور و فکر کی دعوت دیتا ہے جس طرح وہ کائناتی شواہد پر تدبر و تفکر کی دعوت دیتا ہے لیکن 'معرفت' اور غور و فکر کے بعد کسی شئے کے متعلق علم حاصل کرنے میں جو فرق ہے وہ بالکل واضح ہے"۔

لیکن یہ ایمان جس کا بقول طلوع اسلام دین مطالبہ کرتا ہے، کیا چیز ہے؟ کیا محض چند الفاظ کا زبانی تکرار ایمان ہے یا کچھ اور چیز؟ اگر لفظ ایمان کے مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو جس چیز کو صوفیا نے عرفان نفس کا نام دیا ہے یا جس کو اقبال نے کبھی آہ سحرگاہی اور کبھی عشق کے نام سے پکارا ہے، وہی ایمان ہے لیکچرز میں ایک جگہ ایمان کی تشریح کرتے ہوئے اقبال نے لکھا ہے کہ "تسخیرِ کائنات کے دو ذریعے ہیں۔ ایک عقلی اور دوسرا حیاتی (VITAL) عقلی ذریعے سے مراد یہ ہے کہ کائنات کو سلسلۂ علل و معلول کے ایک مربوط اور میکانکی نظام کی حیثیت سے سمجھا جائے (جیسا کہ علم طبیعات میں کیا جاتا ہے) اور حیاتی ذریعہ سے مراد یہ ہے کہ زندگی کی مبرم تقدیر کو مطلقاً تسلیم کیا جائے ــــ یہی حیاتی ذریعۂ تسخیر کائنات ہے جس کو قرآن ایمان سے تعبیر کرتا ہے ــــ ایمان چند مسلمات و عقائد کا محض رسمی اقرار نہیں بلکہ یہ ایک زندہ تیقن ہے جو ایک خاص اندرونی قلبی واردات کا نتیجہ ہے"۔ (صفحہ ۱۰۹) اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے، کہ خدا کی ذات پر ایمان کا مطالبہ جو طلوعِ اسلام کے نزدیک عرفان کے متناقض ہے، دراصل عرفان ہی کا دوسرا نام ہے اور جن کا عین مقصود صحیح ایمان وہی ہے جس کی بنیاد عرفان نفس پر ہو۔ جب تک قلب کی گہرائی میں اتر کر سرچشمۂ حیات یعنی خالق کائنات کے انوار سے روشنی حاصل نہ ہو، صحیح ایمان کی لذت ممکن نہیں۔ ہر وہ ایمان جو محض چند رسمی عقائد کے اقرار پر مبنی ہو، مذہب کے نزدیک قابل قبول نہیں۔ چنانچہ ان لوگوں کے متعلق جنھوں نے خدا پر ایمان کا دعوٰی تو کیا یعنی اقرار زبانی تو ان سے سرزد ہوا لیکن چونکہ ان کا اقرار قلبی تصدیق سے عاری تھا اس لئے قرآن نے ان کے ایمان کو تسلیم نہیں کیا:

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَا هُم بِمُؤْمِنِينَ۔ (۲:۷)

اور بعض لوگ ایسے ہیں جو (زبان سے) کہتے ہیں کہ وہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لائے لیکن حقیقت میں وہ ایمان نہیں لائے۔